محمد سرفراز ۞

سیّد رفیق حسین کے افسانوی کردار

Sayed Rafique Hussain's character of short stories.

By *Muhammad Sarfaraz, Lecturer, Department of Urdu, Govt. Post Graduate College, Samundari.*

ABSTRACT

It is a fact that literature mirrors life but the description of animals is rarely found in it despite the reality that animals have been the close partners of human beings since ages. The Social animal continued forgetting animals after he bade farewell to his primitive age. Western fiction is rich in the tradition of animal characterization but Urdu short story has only a few names with Sayed Rafique Hussain succeeded. His short stories' collection *Aaena-e-Hairat* has a number of animal characters. This article deals with the introduction, research and criticism of his short stories. Unlike the Western and few Urdu writers, he has not depicted his animal characters symbolically but many of his animal characters symbolize human figures.

Keywords: Fiction, Animal, Characterization, Urdu, Short story.

اُردو شاعری میں جو قبولیت غزل کے حصے میں آئی وہی قبولِ عام اردو فکشن میں افسانے کو حاصل ہوا۔ اس مقبولیت کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ اُردو افسانہ اپنے آغاز سے موجودہ عہد تک مواد، ہیئت، اسلوب اور تکنیک کے اعتبار سے ارتقا پذیر رہا ہے۔ عالمی ادبی تحریکوں سے اگر مسابقت نہیں رہی تو اُردو افسانہ ان کا مقلد ضرور رہا ہے۔ ابتدائی دور کی مقصدیت اور اصلاح پسندی سے لے کر علامتی اور تجریدی رجحانات تک افسانہ تنوع کا نمونہ پیش کرتا رہا ہے۔ اس میں علاقائی، جغرافیائی اور معاشرتی تبدیلیوں کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے اور عہد بہ عہد رونما ہوتی مغربی تحریکوں اور رجحانات مثلاً ترقی پسندی (Progressivism)، مارکسزم (Marxism)، رومانویت (Romanticism)، فطرت پسندی (Naturalism)،

۞ لیکچرر، شعبۂ اردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، سمندری

ریشنلزم (Rationalism)، سرئیلزم (Surrealism)، علامت پسندی (Symbolism)، تاثریت (Expressionism)، وجودیت (Existantionalism)، تجریدیت (Abstractionism) وغیرہ کے اثرات نظر آتے ہیں۔ اسی بوقلمونی نے قارئین اور ناقدین کی توجہ اس صنف کی جانب مبذول کروائے رکھی۔

حیوانات ہمیشہ سے انسان کے ہمدم اور ساتھی رہے ہیں لیکن جنگل سے نکل آنے کے بعد انسان نے ان کی طرف شاید ہی مڑ کے دیکھا ہے۔ بہت کم لکھنے والوں نے ان کے جذبات و احساسات کو محسوس کرنے کی کوشش کی ہے۔ اردو افسانے میں اگر اسی قسم کی کوئی باضابطہ کوشش کسی نے کی ہے تو وہ سیّد رفیق حسین (۱۸۹۴ء تا ۱۹۴۴ء)[(۱)] ہیں۔ انھوں نے اردو افسانے میں نئے باب کا اضافہ کیا۔ ڈاکٹر انوار احمد نے بجا طور پر انھیں اُردو افسانے کا اکلوتا قرار دیا ہے۔[(۲)] کیوں کہ انھوں نے جس راہ کا انتخاب کیا وہ کم از کم اردو کے لیے نئی تھی۔ سیّد رفیق حسین نے پہلی مرتبہ حیوانات کو افسانے میں مرکزی کرداروں کی صورت میں پیش کر کے ان کے جذبات، محسوسات کو سمجھنے اور سمجھانے کی سعی کی لیکن یہ کردار نہ تو بعض افسانہ نگاروں کی طرح علامتی طور پر پیش ہوئے ہیں اور نہ یہ شکاریات قسم کی تحریریں ہیں، جو مہم جوئی کے واقعات پر مبنی ہیں۔ دراصل انھوں نے دوپایہ حیوان کی بڑھتی ہوئی آبادی سے معدوم ہوتی جنگلی حیات کے چند نمونے اپنے بھرپور مشاہدے کی روشنی میں پورے تخلیقی رچاؤ کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر مرتسم کر کے پالتو اور جنگلی حیوانات سے کچھ سیکھنے اخذ کرنے کا سامان مہیا کیا ہے اور باور کروایا ہے کہ بظاہر لاقانون نظر آنے والا جنگل دراصل بعض قاعدوں کا پابند ہے اور شقاوت کی جو مثالیں قانون کے پابند معاشرے میں اکثر اوقات دیکھنے میں آتی ہیں جنگل میں نہیں ملتیں۔ ایک افسانے کے حاشیے میں لکھتے ہیں:

> ''اصلیت یہ ہے کہ دہلی اور بمبئی سے کہیں زیادہ محفوظ جنگل میں پھرنا ہوتا ہے۔''[(۳)]

سیّد رفیق حسین کی افسانوی کاوشیں اوّل اوّل شاہد احمد دہلوی کے ماہوار رسالے ''ساقی'' دہلی کے توسط سے منظرِ عام پر آئیں۔ ان کا پہلا افسانہ ''کفارہ'' کے عنوان سے اسی رسالے میں فروری ۱۹۳۹ء کے شمارے میں طبع ہوا۔[(۴)] اس کے بعد یہاں ان کے افسانے اور مضامین یکے بعد دیگرے شائع ہوتے رہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''آئینۂ حیرت'' کے نام سے ۱۹۴۴ء میں ساقی بک ڈپو دہلی سے چھپا۔ اس میں حیوانات کے متعلق ان کے آٹھ افسانے ''کفارہ''، ''کلوا''، ''بیرو''، ''گوری ہو گوری''، ''آئینۂ حیرت''، ''ہر فرعونے را موسیٰ''، ''شیریں فرہاد'' اور ''بے زبان'' کے عنوانات کے تحت شائع ہوئے۔ یہی افسانوی مجموعہ بعد میں مختلف شہروں سے مختلف عنوانات سے چھپا۔ کراچی میں اردو اکیڈمی سندھ نے اپریل ۱۹۵۲ء میں ''گوری ہو گوری'' کے نام سے شائع کیا۔ راول پنڈی سے ان کے بھتیجے میجر جنرل شاہد حامد نے ''بے زبان'' کے عنوان سے شائع کروایا اور چوتھی بار کتاب کار پبلی کیشنز، یوپی، بھارت سے ''شیر کیا سوچتا ہوگا'' کے

نام سے شائع ہوا۔''(۵)

''نیا دور'' کراچی کے شمارہ نمبر ۴۵، ۴۶ جون ۱۹۶۸ء میں ان کے افسانوں اور مضامین کا انتخاب شائع ہوا۔ اسی شمارے میں ایک ادھورا ناولٹ ''فسانۂ اکبر'' کے نام سے چھپا اس ناولٹ کی ابتدا میں ان کی خودنوشت سوانح بھی ہے۔ ۲۰۰۲ء میں آج کراچی نے ان کی کلیات ''آئینۂ حیرت اور دوسری تحریریں'' کے عنوان سے اور ۲۰۰۴ء میں سنگِ میل لاہور نے مجموعہ سیّد رفیق حسین کے نام سے طبع کی۔ حال ہی میں الحمد پبلی کیشنز، لاہور نے ان کی افسانوی کلیات ''سیّد رفیق حسین کے بے مثال افسانے'' کے عنوان سے شایع کی ہے۔تاہم ''ساقی'' دہلی میں بالترتیب مارچ، اگست، اکتوبر ۱۹۳۹ء کے شماروں میں چھپے ان کے مضامین ''ریورس گیئر''، ''چاے بازی'' اور ''پریشانیاں'' کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔

ان کا اصل کارنامہ ''آئینۂ حیرت'' میں شامل افسانے ہی ہیں۔ باقی افسانے اور مضامین اس پائے کے نہیں کہ ان کو اچھوتے موضوعات کا حامل کہا جا سکے۔ تاہم ناولٹ تکنیک کے اعتبار سے منفرد ضرور ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ حیوانات کا ذکر کتب سماوی اور مذہبی کتابوں میں بھی کثرت سے ملتا ہے اور داستانوں، لوک کہانیوں میں بھی لیکن ادب میں ان کا تذکرہ خال خال نظر آتا ہے اور جہاں کہیں ذکر ہوا ہے خاص طور پر مشرقی ادب میں تو وہ بھی لوک دانش کے اظہار کے ایک ذریعے کے طور پر۔ جانوروں کی نفسیات، طرزِ زندگی، اصول وضوابط، پسند ناپسند، بہت کم زیر بحث آیا ہے۔ مصوری نے البتہ نقش ہاے رنگ رنگ میں حیوانات کو زیادہ اہمیت کا حامل گردانا ہے۔ انگریزی زبان میں جس کا مرہونِ منت اردو افسانہ ہے اس حوالے سے شاعری میں چوسر (Parliment of Foulst)، اڈمنڈ اسپنسر (The Faerie Queen)، ملٹن (Paradise Lost)، کے نام پیش کرتی ہے جب کہ نثر میں کپلنگ (The Jungle Book)، آسکر وائلڈ (The Happy Prince)، ارنسٹ ہیمنگوے (The Old Man and the Sea)، جارج آرول (Animal Farm)، ریمن گیرے (The Roots of Heaven)، جوناتھن سوئفٹ (Gulliver's Travels)، بن جانسن، رچرڈ ایڈمز، سی ایس لیوس، جیک لنڈن، جیمز ہیریٹ، بیلجیئن مصنف ماترلنک وغیرہ بڑے نام ہیں۔

اردو افسانے میں اس نوع کی اکا دکا سرسری مثالیں کچھ افسانہ نگاروں مثلاً راشد الخیری، یلدرم، ابوالفضل صدیقی، خان فضل الرحمٰن، اوپندر ناتھ اشک، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، انتظار حسین کے ہاں مل جاتی ہیں۔ تاہم اس موضوع پر تواتر اور خوب صورتی سے سیّد رفیق حسین نے ہی لکھا ہے۔ اس کے باوجود ہماری افسانوی تنقید نے انھیں وہ پذیرائی نہیں دی جس کے وہ مستحق ہیں۔ اگرچہ ان کا عملی طور پر شعبہ انجینئرنگ تھا لیکن انھیں سیر و شکار کا بھی تجربہ تھا۔ اس لیے جنگل اور جانوروں سے کافی واسطہ رہا۔ شکار سے زیادہ وہ جانوروں کے عادات وخصائل کا مشاہدہ کرتے تھے۔ جانوروں سے ان کی خصوصی دل چسپی اور لگاؤ کی تصدیق ان کے عزیزوں نے کئی جگہوں پر کی ہے ان کے بھانجے فضل قدیر کا کہنا ہے:

> وہ یقیناً شکار میں اتنی گہری دل چسپی نہیں رکھتے تھے جتنی جنگل میں جانوروں کو دیکھنے اور ان کے نفسیات کا مشاہدہ کرنے میں رکھتے تھے۔ کانپور میں زندگی کے آخری ایام میں یہ بات انھوں نے زور دے دے کر خود مجھ سے کہی کہ میں کوئی بڑا شکاری نہیں تھا اور نہ ایسا سمجھتا ہی ہوں میں نے اکثر راتیں پیڑ پر صرف اس لیے گزار دیں کہ دیکھوں شیر ادھ کھائے شکار کو دوسرے دن کس طرح کھاتا ہے۔[۶]

ان کی اس محویت اور وارفتگی کو بعض اوقات باؤلے پن اور سنکی پن پر محمول کیا جاتا جس کا ادراک انھیں خود بھی تھا اپنی خودنوشت سوانح کے آغاز میں اپنے متعلق لوگوں کی رائے کا اظہار خود بھی کر چکے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ ان کی بھانجی معروف ناول نگار اور افسانہ نویس الطاف فاطمہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> الطاف کو رفیق حسین کے ساتھ میرے قلبی لگاؤ کا علم تھا کہ میں بھی جانوروں اور پرندوں سے بہت قربت محسوس کرتا تھا۔ چناں چہ اکثر ان کا ذکر چھڑ جاتا کہ کیسے مستقل مزاجی ان کی خصلت میں نہ تھی۔ کبھی ملازمت چھوڑ دیتے، غائب ہو جاتے، کبھی کسی ایک مکوڑے پر پہروں جھکے رہتے کہ یہ حرکت کیسے کرتا ہے، اس کی بناوٹ کیسی ہے، کھاتا کیا ہے اور پھر الطاف ہنس کر کہتیں وہ تھوڑے باؤلے تھے۔[۷]

دراصل جس موضوع کا انتخاب انھوں نے کیا تھا وہ اس ژرف نگاہی، مشاہداتی قوت، باریک بینی کا متقاضی تھا اور انھوں نے بھی حیوانات کی عادات اور خصلتوں کے مشاہدے، مطالعے اور بعد میں اظہار کا حق ادا کر دیا۔ وہ جانوروں کی نفسیات تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اس میں کامیاب بھی ٹھہرتے تھے جو جانور بھی ان کے افسانے کا مرکزی کردار بنا ہے، اس کا طرزِ زندگی، عادات و اطوار بڑی حد تک آشکار ہو گئے ہیں۔ حیوانی زندگی کے مطالعے اور مشاہدے پر مبنی یہ مرقعے دل چسپ بھی ہیں اور حقائق پر استوار بھی۔ اظہار کا سلیقہ بھی ان کے ہاں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ اگرچہ بعض جگہوں پر جب وہ حیوانی زندگی کو انسانوں کے ساتھ آمیز کرنے لگتے ہیں یا تقابل کرنا چاہتے ہیں تو جوشِ خطابت میں افسانے کے فنی خصائص کو نقصان پہنچا جاتے ہیں۔ بقول اختر حسین رائے پوری:

> وہ انسان کی ظلم پسندی اور خود غرضی سے اس قدر نالاں ہیں کہ قصہ سناتے سناتے رک کر بیچ بیچ میں اس کی تنبیہ کرنے لگتے ہیں اور افسانہ کے آخر میں عموماً اسے نصیحت کا تازیانہ لگا دیتے ہیں۔ یہ ایک فنی نقص ہے جس سے کاش وہ احتراز کرتے۔[۸]

جس زمانے میں سیّد رفیق حسین لکھ رہے تھے وہ دور ہی دراصل اصلاح پسندی اور مقصدیت کے بار کو اُٹھائے

ہوئے تھا وہ بھی ان اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے۔ تاہم حیوانی زندگی کے پہلو بہ پہلو انسانی زندگی کو لے کر چلنا منفرد تخلیقی تجربہ ہے۔ آخر کسی تخلیق کار نے تو شہری دیہی زندگی سے آگے ایک قدم جنگل کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھا یا اپنے اردگرد صدیوں سے موجود پالتو جانوروں کی بے زبانی کو زبان دی۔ جنگل اور اس کے مناظر ان افسانوں میں سرگوشیاں کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ عام آدمی جنگل کے بارے میں جو گمان رکھتا ہے اور جنگل کے اصل حقائق میں جو تفاوت ہے وہ ان کے افسانے ''کفارہ'' میں کھل کر سامنے آتا ہے۔ ''کفارہ'' اور ''ہر فرعونے را موسیٰ'' جنگل اور شکار کے متعلق ان کی معلومات کے حوالے سے شاہکار افسانے ہیں لیکن وہ جنگل اور جنگلی حیات کو محض ایک شکاری کی نظر سے نہیں بلکہ تخلیق کار کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ''جو چیز رفیق حسین کے افسانوں کو محض شکاری یا جنگل کے مشاہدات سے بلند کر کے بڑی سے بڑی اور حسین سے حسین تخلیق بنا دیتی ہے وہ ان کا وہ طرزِ احساس اور منفرد اندازِ نظر ہے جو زندگی کے اعلیٰ ترین شعور، نفسیاتی پیچیدگیوں کی آگہی اور سیاہ و سفید، گناہ و ثواب، جرم و سزا، نیکی و بدی اور عدل و انصاف کو ابدی صداقتوں کے پیمانے پر اسی طرح پیش کرتا ہے کہ اس میں ادب کی اعلیٰ ترین صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔''[۹] وہ حیوانات کو جنگل کے قوانین کے حوالے سے پرکھتے ہیں۔ حیوان اگرچہ کئی جگہوں پر ان کے ہاں فوقیت رکھتے ہیں مگر انسان کی عظمت مقدم ہے۔ حیوانات بجا طور پر اس کے معترف ہیں۔ ''کفارہ'' میں قتل کا مرتکب مفرور بہاری جب شیروں کا شکار کردہ بچا گوشت چرانے کی پاداش میں شیرنی کے غضب کا شکار ہو کر لقمۂ اجل بنتا ہے تو شیر، شیرنی سے یوں کنارہ کش ہوتا ہے:

> شیر انسان سے نہ ڈرتا تھا لیکن جنگل کے قوانین اس طرح شکن ہوتے دیکھ کر تھرا گیا، وہ آہستہ سے گھوما اور خوں، خوں، خوں، خوں غراتا ہوا شیرنی کو ہمیشہ کے واسطے چھوڑ کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔[۱۰]

ان کے مطابق انسان، انسان کی عظمت کا قائل نہ ہوا ورنہ درندے بھی اس سے لرزہ براندام ہیں۔ ''کفارہ'' افسانہ جنگل کے مناظر، جنگل کے قوانین، جنگلی حیات کی تصویر کشی کے علاوہ شیر کے شکار کے لیے اپنائے جانے والے طریقوں اور اس کی نفسیات پر روشنی ڈالتا ہے۔ شیر کے شکار کرنے اور انسان کے شکار کرنے میں بہت فرق ہے جنگل کے جانور اس درندے سے اتنا خوفزدہ نہیں ہوتے جتنا مہذب انسان سے ہوتے ہیں کیوں کہ ''شیر باوجود درندہ ہونے کے جنگل کا رہنے والا ان کا ہمسایہ ہے جس کی موجودگی ان کو چار و ناچار گوارا کرنی پڑتی ہے۔ وہ جنگل کا بادشاہ ہے جس کو ہر ہفتے ان کے گلے میں سے کسی ایک کی جان کا خراج دینا ہوتا ہے لیکن وہ انسانوں کی طرح ظالم نہیں ہے۔ وہ بلاضرورت محض جان لینے اور خون بہانے کے واسطے کبھی شکار نہیں کرتا۔ جب اس کا پیٹ بھرا ہوتا ہے تو وہ ان کے سامنے تک نہیں آتا اور اگر سامنا بھی ہو جائے تو فوراً ہٹ جاتا ہے اس کو چوپایوں کو بلاوجہ ڈرانے کی عادت نہیں......

جنگل کو کھلبلا دینا اور جانوروں پر ہیبت طاری کر دینا اس کا کام نہیں یہ گلوں کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے اور ان میں سے بالکل اسی طرح خوراک حاصل کرتا ہے جیسے کہ ایک دوراندیش مالی اپنے کھیتوں میں سے ترکاری بتدریج نکالتا ہے گوشت کو برباد اور ضائع کرنے سے اسے نفرت ہے۔''(۱۱) اس کے برعکس انسان کا جنگل میں شکار کا طریقہ وہ ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

> برخلاف اس کے جس وقت انسان قتل اور غارت کے جذبے سے بھرا ہوا جنگل میں گھس آتا ہے تو یہاں کی دنیا ہی خوف ہراس سے درہم برہم ہو جاتی ہے وہ بلاضرورت اور بلاامتیاز جانیں لیتا ہے۔(۱۲)

باوجود اس کے دوٹانگوں والا حیوان مہذب ہونے کا دعویدار ہے۔''کلوا'' کا مرکزی کردار ''کلوا'' نامی کتا ہے۔ پطرس کے ''کتے'' کی طرح اس کے بھی بعض حصے علامتی نظر آتے ہیں۔ افسانے سے کتوں کی عادات، جبلت، سوچ، مشکل زندگی کی عکاسی ہوتی ہے۔''کلوا'' کی داستانِ حیات دائروی انداز سے چلتی ہے۔ وہ منن کے ہاتھوں میں زندگی کے ابتدائی ایام گزارتا ہے۔ بالآخر اس کی محبت میں اس کی جان بچا کر اپنی جان دے دیتا ہے۔''کلوا'' منن کے سخت گیر باپ کی وجہ سے گھر سے نکالا گیا۔ کہار کی لونڈیا چندو کی نگہداشت میں آیا۔ چندو نے بڑے چاؤ سے اسے رکھا اور کلوا کا نام دیا۔ چندو کے ایک ناکام عاشق بھوریا کی مخاصمت کی بنا پر یہ در بھی چھوٹا۔ مدت بعد صعوبتیں سہتا چندو کی محبت میں واپس لوٹا تو وقت کافی آگے نکل چکا تھا جس طرح وہ خود آوارہ پلے سے خونخوار قدآور کتا بن چکا تھا۔ دلہن چندوا سے بھول چکی تھی لیکن وہ ابھی تک اسے یاد رکھے ہوا تھا۔کلوا کی انسانوں سے محبت اور وفاداری ظاہر کرتی ہے کہ انسان تو فراموش کر دیتے ہیں مگر جانور نہیں۔ کتے کی فطرت کے متعلق ان کا یہ بیان صداقت پر مبنی ہے:

> جفاکاری میں بھینسا کتے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ استقلال میں پتھر کی سل کتے کے آگے گھس جائے گی۔خونخواری اور دلیری میں جس وقت کتے سے مقابلہ پڑتا ہے تو شیر بھی پیچھے ہٹ جاتے ہیں لیکن محبت کی ایک چھوٹی سی چمکاری میں کتا پیروں پر گر پڑتا ہے اور اس وقت وہ حلم، عاجزی، انکساری اور خاکساری ایسی رقیق چیزوں کی جیتی جاگتی تصویر ہوتا ہے۔(۱۳)

ان عادات کی بدولت کلاسیکی پنجابی شاعری میں بھی کتا بہ نظرِ استحسان دیکھا گیا ہے۔ رفیق حسین کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کی قوتِ مشاہدہ بار بار چونکاتی ہے۔ آوارہ کتوں کی علاقے تقسیم کرنے اور ان کی بھرپور حفاظت کرنے کی جو تصویر انھوں نے اس افسانے میں دکھائی ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے ان کے خیال میں انسانوں کے برعکس کتا

انسانی چہرے سے خوشی، غم، محبت کے جذبات پڑھ لینے کی اہلیت رکھتا ہے۔''کلوا'' میں کتوں کی چھینا جھپٹی اور طرزِ زندگی معاشرتی زوال کی علامت بھی ہے اور زوال آمادہ معاشرے کے چند کرداروں کی بھی۔

''بیرو'' سانڈ کے کردار کو پیش کرتا ہے جو نیل گایوں کی محبت میں گرفتار ہے لیکن پالتو ہونے کی وجہ سے ناک اور گلے میں غلامی کے دو نشانات کی وجہ سے جنگل کے فطری طور پر آزاد جانوروں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہے۔ رفیق حسین کے نزدیک عشق حیوانی جذبہ ہے جو انسان اور حیوان دونوں پر جنون طاری کر دیتا ہے۔ بیرو، شیر اور ریچھ کو اس جنونی کیفیت میں پچھاڑ کر موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ بیرو اس وقت کے محکوم معاشرے اور موجودہ غلام ذہنیت کے حامل معاشرے میں بلیغ علامت نظر آتا ہے۔

''گوری ہو گوری'' اور طویل مختصر افسانہ ''آئینۂ حیرت'' ممتا کے جذبات کی عمدہ عکاسی ہیں۔ اوّل الذکر کا مرکزی کردار گاے ہے اور ثانی الذکر کا بندریا۔ گاے کے کردار کے پس پشت گئو ماتا والی فکر کارفرما ہے۔ بسنتی اپنی بیٹی رمکلیا کو سیلاب میں مرنے کے لیے چھوڑ آتی ہے مگر گوری ممتا کے جذبات سے مملو بچھڑے اور رمکلیا دونوں کو بحفاظت بچا لاتی ہے۔ افسانے کے آخر میں گوری کے یہ الفاظ انسانوں کے لیے معنی خیز ہیں:

''تم۔ ماں آں ھ۔ ہم ماں آں ھ''(۱۴)

افسانے میں سیلاب کی علامت معاشرتی خودغرضی، بےحسی کے تموج میں گم ہوتی بنیادی انسانی جبلّتوں کی نوحہ خوانی ہے جو افسانے کی معنویت کو دوچند کرتی ہے۔

''آئینۂ حیرت'' انسانی تکبر، غرور بےحسی، منافقت، ضعیف الاعتقادی، توہم پرستی کے درمیان ممتا کی جدوجہد اور وابستگی کی داستان ہے جو اپنا بچہ نہ ملنے کی صورت میں انسانی بچے کو سینے سے چمٹا کر اس کی حفاظت کرتے مر جاتی ہے۔ دیگر انسانوں کی طرح افسانہ نگار یہاں بھی انسانوں پر حیوان کی اخلاقی برتری ثابت کرتا ہے اور ماہر فن کار کی طرح اس کا قلم بشری کمزوریوں کی نوحہ گری کرتا محسوس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد کے بقول:

> یہ خیال نہیں کیا جانا چاہیے کہ رفیق حسین کی جانوروں اور جنگلوں میں دل چسپی فن براے فن قسم کی کوئی چیز ہے، وہ جانوروں کے ہاں اصول پسندی، ممتا، ایثار اور احساسِ رفاقت کو اس طرح اُبھارتے ہیں کہ ہماری دنیا کی تہی دامنی اور نمایاں ہو جاتی ہے۔(۱۵)

''ہر فرعونے را موسیٰ'' فطرت کی ظالم قوتوں کے مقابلے میں انسانی جدوجہد کی کہانی ہے۔ مرکزی کردار کانا ہاتھی انسانوں جانوروں اور درندوں تک کے لیے خوف دہشت کی علامت بن کر دندناتا پھرتا ہے اور اس کا خاتمہ بیٹے کے قتل کے انتقام میں سلگتے بوڑھے باپ ماہر شکاری کے ہاتھوں ہوتا ہے۔ افسانہ مصنف کے جنگل کے رمز شناس ہونے، شکار کی

باریکیوں سے آگاہ ہونے کے علاوہ چڑی مار قسم کے شیخی بازوں، بزدلوں پر گہرا طنز ہے۔ انگریز افسر میجر بوسٹ جیسے سطحی لوگ بالآخر بے نقاب ہوتے ہیں۔

''شیریں فرہاد'' بلی اور بلے کی داستانِ حیات کو ظاہر کرتا ہے۔ انجام ڈرامائی اور بھیانک ہے۔ بلا جبلت کا غلام دکھایا گیا ہے جو بھوک کے عالم میں ہم جنس کو کھا جانے کے بعد اسے گلیوں گلیوں ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ افسانہ انسانی پشیمانی کی علامت بھی ہے۔

کتا اور گھوڑا پالتو جانوروں میں سب سے زیادہ وفادار سمجھے جانے والے جانور ہیں۔ بے زبان کے مرکزی کردار سرکس کی منھ زور گھوڑی اور گونگی لڑکی ہیں۔ دونوں کی یکساں بے بسی، کسمپرسی افسانے کے عنوان سے عیاں ہوتی ہے۔ افسانہ اشرافیہ کی بے راہ روی اور اس کے نتیجے میں لازمی زوال کی عکاسی کے ساتھ گھوڑی کی لڑکی سے اَن مٹ محبت، خلوص، وفاداری کا عکاس ہے۔ انجام ڈرامائی اور غیر منطقی ہونے کے باوجود بھی افسانہ تاثیر کا حامل ہے۔

سیّد رفیق حسین نے حیوان اور انسان کی نفسیات کشائی کرتے ہوئے ان دل چسپ مرقعوں کو بھرپور تخلیقی انداز سے پیش کیا ہے۔ موضوع کی انفرادیت کی وجہ سے اگرچہ ان کے اسلوب بیان پر نگاہ کم جاتی ہے لیکن جنگل کے مناظر کی تصویر کشی اور جزئیات نگاری ان کے ادیبانہ رنگ اور زبان و بیان پر مہارت کی غماز ہے۔ مصوری کے فن میں عملاً سدھ بدھ رکھنے کے علاوہ ان کی لفظیاتی مصوری بھی کمال کی ہے۔ بقول فردوس انور قاضی:

> رفیق حسین کا اسلوب دل چسپ ہے۔ تحریر میں پختگی ہے اور سب سے بڑی چیز جو انھیں افسانہ نگاری میں منفرد اور اہم مقام بخشتی ہے وہ اردو افسانہ نگاری کو ایک نئے رجحان سے روشناس کرانا ہے۔[۱۶]

اگرچہ رفیق حسین نے ایک منفرد موضوع سے اردو ادب کو مالا مال کیا لیکن یہ رجحان نہیں بن سکا ان کے بعد بہت کم افسانہ نگاروں نے اس طرف توجہ کی۔ شاید اس موضوع کو گرفت میں لانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

رفیق حسین کے افسانے بزعم خود برتر اور مہذب ہونے والے انسان کی غلط فہمیوں کا چشم کشا بیان ہیں۔ انسان نے بستیاں اور شہر بسا کر انسانیت کو ترقی دینے کی بجائے فطری اچھی خصلتوں کو گم کر دیا ہے اور برتر ہونے کے برعکس کمتر ہوتا جا رہا ہے۔ انسانی عقل ہی اسے گمراہ کرتی ہے۔ ان کے مطابق:

> جانوروں کو جبلّت (Instinct) کا سرمایہ دیا گیا ہے۔ جس میں غلطی کا احتمال ہی نہیں اور ہم کو عقل! جو ہر قدم پر ٹھوکر کھاتی ہے۔[۱۷]

سیّد رفیق حسین نے حیوانات کو اچھائیوں اور برائیوں سمیت پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ بہت سارے معاملات

میں انسان اورحیوان یکساں ہیں۔ انسان نے خود ہی برتری کے تمام مراحل عبور کر لیے ہیں۔ حیوانات اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ یہ کبھی ہم نے پوچھا ہی نہیں۔ حیوانات ان کے افسانوں میں جہاں محبت، خلوص، مامتا، ایثار، قربانی، رفاقت، وفا کا مظاہرہ کرتے ہیں وہیں طاقت، نفرت، انتقام، غصے کے مظہر بھی ہیں۔ کردار نگاری، فطرت نگاری، منظر نگاری، جذبات، نفسیات کی عکاسی غرض کئی حوالوں سے یہ افسانے منفرد ہیں۔ انسانی کرداروں کے جھرمٹ میں حیوانی کردار کی پیش کش مصنف کی انفرادی سوچ کی غماز بھی ہے جو انھیں افسانے کی روایت میں ہمیشہ زندہ و جاوید رکھے گی۔

حواشی

۱۔ ''فسانہ اکبر'' میں خود انھوں نے اپنا سال پیدائش ۱۸۹۴ء لکھا ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد نے ان کی وفات کا سال ۱۹۴۶ء لکھا ہے جب کہ ان کی بھانجی الطاف فاطمہ نے جو خاکہ اپنے ماموں کا ''خزاں کے رنگ'' کے عنوان سے لکھا اس میں بتایا ہے کہ ان کی کتاب ''آئینۂ حیرت'' ان کی وفات کے چند روز بعد شائع ہوئی۔ یہ کتاب چوں کہ ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی تھی اس لیے ان کی وفات کا سال ۱۹۴۴ء بنتا ہے۔

۲۔ ڈاکٹر انوار احمد، ''اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ''، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء، ص ۴۱۹

۳۔ سیّد رفیق حسین، ''مجموعہ سیّد رفیق حسین''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۲۲

۴۔ ڈاکٹر انوار احمد کو تسامح ہوا ہے۔ ان کے خیال میں سیّد رفیق حسین کا پہلا افسانہ ''کفارہ'' ساقی میں ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ شاید اسی کو بنیاد بنا کر مرزا حامد بیگ نے ''اردو افسانے کی روایت'' میں اس روایت کو دہرا دیا ہے۔ مذکورہ افسانہ اسی رسالے میں فروری ۱۹۳۹ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

۵۔ مرزا حامد بیگ، ''اردو افسانے کی روایت''، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۸۰۵

۶۔ فضل قدیر، ''کچھ میری زبانی''، مشمولہ ''مجموعہ سیّد رفیق حسین''، ص ۳۴۳

۷۔ مستنصر حسین تارڑ، ''دستک نہ دو''، الطاف فاطمہ (کالم) مشمولہ روزنامہ ''۹۲ نیوز''، فیصل آباد، جلد ۲، شمارہ ۱۱۹، ۱۳ جنوری ۲۰۱۹ء، ص ۱۰

۸۔ اختر حسین رائے پوری، ''حیوان اور انسان'' مشمولہ ''نیا دور'' (مدیران: قمر سلطانہ، جمیلہ ہاشمی، شمیم احمد)، شمارہ ۴۵، ۴۶، کراچی: پاکستان کلچرل سوسائٹی، جون ۱۹۶۸ء، ص ۹۳

۹۔ شمیم احمد، ''انوکھا افسانہ نگار''، مشمولہ ''نیا دور''، ص ۱۱۵

۱۰۔ سیّد رفیق حسین، ''مجموعہ سیّد رفیق حسین''، ص ۲۱

۱۱۔ ایضاً، ص ۴۴

۱۲۔ ایضاً، ص ۴۵

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۴

۱۴۔ ایضاً، ص ۶۱

۱۵۔ ڈاکٹر انوار احمد، ''اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ''، ص ۴۲۰

۱۶۔ ڈاکٹر فردوس انور قاضی، ''اردو افسانہ نگاری کے رجحانات''، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۰ء، ص ۴۳۳

۱۷۔ سیّد رفیق حسین، ''مجموعہ سیّد رفیق حسین''، ص ۳۵

مآخذ

۱۔ احمد، انوار، ''اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ''، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء۔

۲۔ حامد بیگ، مرزا، ''اردو افسانے کی روایت''، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء۔

۳۔ رفیق حسین، سیّد، ''مجموعہ سیّد رفیق حسین''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء۔

۴۔ قاضی، ڈاکٹر فردوس انور، ''اردو افسانہ نگاری کے رجحانات''، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۰ء۔

۵۔ قدیر، فضل، ''کچھ میری زبانی''، مشمولہ ''مجموعہ سیّد رفیق حسین''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء۔

رسائل و جرائد

۱۔ احمد، شمیم، ''انوکھا افسانہ نگار''، مشمولہ ''نیا دور''، کراچی۔

۲۔ تارڑ، مستنصر حسین، ''دستک نہ دو''، الطاف فاطمہ (کالم) مشمولہ روزنامہ ''۹۲ نیوز''، فیصل آباد، جلد ۲، شمارہ ۱۱۹، ۱۳ جنوری ۲۰۱۹ء۔

۳۔ رائے پوری، اختر حسین، ''حیوان اور انسان'' مشمولہ ''نیا دور'' (مدیران: قمر سلطانہ، جمیلہ ہاشمی، شمیم احمد)، شمارہ ۴۵، ۴۶، کراچی: پاکستان کلچرل سوسائٹی، جون ۱۹۶۸ء۔